خالد ندیم
صدرِ شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

اردو میں منظوم مکتوب نگاری کی روایت

Dr. Khalid Nadeem
Head Department of Urdu, Sargodha University, Sargodha.

Tradition of Poetic letter writing in Urdu

The tradition of poetic letters in the subcontinent begins with the Persian letters of Abdul Haq Mohaddess Dehlavi (1551-1642). In this regard, the names of Nazir Akbarabadi, Insha Allah Khan Insha, Mirza Ghalib, Shibli Noumani and Habib-ur-Rehman Khan Sherwani are worth mentioning. Urdu letter writing started in the subcontinent in 1803, while the trend of poetic letters were originated in 1761 in Hyderabad Deccan. The series of correspondence started in the latter half of the eighteenth century and continued till the twenty-first century. Some of these letters are specifically poetic, while others are written as regular letters. Under the light of these evidences, it can be said that although the tradition of poetic letters has not progressed eminently, there are many possibilities that it could. These possibilities can be gauged from the letters of Sher Muhammad Khan Iman (Deid: 1806), Saadat Yar Khan Rangeen (1757-1835), Nawab Shafta, Mirza Ghalib, Nawab Alauddin Khan Alai, Hakeem Sultan Rampuri, Akbar Alahabadi, Shibli Noumani, Allama Iqbal, Hakeem Ahmad Shujaa, Qamar-ul-Huda Firdousi and Raza Naqvi Wahi. Among them, the poems of Ghalib, Alai, Akbar and Shibli are particularly written in the form of letters. If the researchers dig deeper into this tradition, tremendous results can be concluded and thus a new dimension is more likely to be appeared in the history of Urdu literature.

Key Words: *Urdu, letters, poetic letters, history, literature.*

برعظیم میں منظوم مکتوب نگاری کی روایت میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا اسمِ گرامی قابلِ ذکر ہے۔ **صحیفہ المؤدۃ** اُن کے اُن منظوم خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کو تحریر کیے؛ لیکن ڈاکٹر عبد السلام جیلانی کی تحقیق کے مطابق، کسی کتب خانے میں اس کے قلمی نسخے کی موجودگی کی اطلاع نہیں مل سکی؛[۱] البتہ اردو کے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰ء– ۱۸۳۰ء) کے فارسی کلام میں مثنوی کی ہیئت میں لکھے گئے پانچ مختصر خطوط مل جاتے ہیں، جن میں ادبی چاشنی کے علاوہ خط نگاری کے بعض مطالبات کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا (۱۷۵۲ء– ۱۸۱۷ء) کے ہاں فارسی

میں تیرہ اشعار پر مشتمل ایک منظوم مکتوب ملتا ہے، جو بقولِ آزاد، ایک ایرانی تازہ وارد کو کسی موقع پر لکھ کر بھیجا تھا۔[۲] برِ عظیم میں فارسی منظوم مکتوب نگاری کا سلسلہ غالب اور شبلی، بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی تک پھیلا ہوا ہے۔

مطبوعہ اردو نثری مکاتیب کے سلسلے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد کی تحقیقات کی رُو سے پہلا اردو خط ۱۸۰۳ء میں تحریر ہوا۔[۳] یہ اردو خط عالمگیر ثانی کے برادرِ خرد اعز الدین کی پوتی اور شہزادہ محمد علاء الدولہ کی بیٹی فقیرہ بیگم نے اورنگ زیب عالم گیر کے پوتی نواب عفت آرا بیگم کے نواسے مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت (اظفر دہلوی) کے نام تحریر کیا۔ یہ رقعہ واقعاتِ اظفری میں شامل ہے۔ تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کے مندرجات درج کیے جاتے ہیں:

> ازیں جانبہ بعد سلام واشتیاق تمام کے معلوم فرماویں کہ آپ ہمشیرہ صاحب سے ملاقات فرما کر جو اُس سمت کو تشریف فرما ہوئے ہیں، اُس دِن سے اپنی خیریت کی خبر سے یاد و شاد نہیں فرمایا کہ دل ہمارا تمھاری خیریت کا نگراں ہے۔ امید ہے کہ دوستیِ قدیمی کو یاد فرما کر اپنی خیریت کی خبر سے اطلاع بخشو، جو خاطر اپنی جمع ہو۔
>
> از طرف برخوردار من کہ اسم معلوم است۔ سلام نیاز قبول باد از ہمشیرہ صاحبہ نیز زیادہ چہ محررہ یازدہم رجب المرجب سنہ الیہ[۴]

ساتھ ہی ساتھ گارسیں دتاسی کی تالیف Appendice aux Rudimens de la Langue Hindoustani کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، جس میں نمونے کے طور پر اردو میں لکھے گئے اٹھارہ نجی خطوط دیے گئے ہیں، جو ہندوستان کے مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان خطوں میں سے اکثر پر زمانہ تحریر درج نہیں ہے؛ البتہ جن خطوں پر تاریخ درج کی گئی ہے، ان میں سے قدیم ترین خط ۱۰ر جنوری ۱۸۱۰ء کو معرضِ تحریر میں آیا، جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ایک ملازم افتخار الدین علی خاں شہرتؔ نے کالج کے کسی اور منشی کو لکھا تھا۔[۵]

نثری خطوط کے برعکس اردو میں منظوم مکتوب نگاری کا آغاز ۱۷۶۱ء میں ہو چکا تھا۔ یہ خطوط کتابت حیدرآباد دکن کے دو منصب داروں (میر ابراہیم جیوان اور مرزا یار علی بیگ) کی باہم مراسلت پر مشتمل ہیں اور اَب یہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن میں محفوظ ہیں،[۶] لیکن راقم کو ان خطوں سے براہِ راست استفادے کا موقع نہیں مل سکا؛ البتہ حیدرآباد ہی کے ایک معروف شاعر شیر محمد خاں ایمانؔ (متوفی: ۱۸۰۶ء) کی کلیات میں 'نامہ منظوم' کے عنوان سے مثنوی کی ہیئت میں چار خط ملتے ہیں۔ ان کا پہلا 'نامہ منظوم' انیس اشعار پر مشتمل ہے، دوسرے میں چودہ اور تیسرے اور چوتھے میں بیس بیس اشعار شامل ہیں۔ ان خطوں کی ایک خصوصیت ان کا مکمل ہونا ہے۔ انھیں باقاعدہ خط تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن منظوم مکتوب نگاری کی روایت میں یہ خطوط اپنے بعض خصائص کی بنا پر اہمیت کے حامل ہیں۔ 'نامہ منظوم' کے آغاز میں مکتوب الیہ کو یوں مخاطب کیا گیا ہے:

> اے سروِ باغِ عزّ و شرافت　　　　پاکیزۂ دُرِّ بحرِ لطافت[۷]

ایمان اُن خطوں کا ذکر بھی کرتے ہیں، جس کے جواب میں یہ خط لکھے گئے:

نامہ پہنچا بہ صد فصاحت　　　دل کو بخشا عجب ہے راحت(۸)

ساتھ ہی ساتھ مکتوب الیہ سے شکوہ شکایت بھی ہے:

منچلا کوئی اس قدر نہ ہو　　　کوہکن سے بھی یہ جگر نہ ہو
نام سے تیرے باندھے ہے کمر　　　رزمِ عشق پر ہو جس کی نظر
عشق کو ہووے تجھ سے آبرو　　　نام ہو کیوں نہ تیرا چار سُو
جب تلک نہیں آوے ہے پیام　　　یاد کے سوا کچھ نہیں ہے کام
ہم تو سب طرح تجھ سے خوش ہووے　　　نامہ اس لیے بارہا لکھے(۹)

ایمانؔ نے ان منظوم مکاتیب کے اختتامیے اس طور تشکیل دیے ہیں کہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خط کے آخری مصارع ہیں:

ہم تا بہ مقدور حاضر ہیں صاحب　　　لطف و کرم کے تیرے ہیں طالب
اللہ تجھ کو رکھے سلامت　　　با ذوق و اُنست، با شوق و اُلفت(۱۰)

سعادت یار خاں رنگین (۱۷۵۷ء– ۱۸۳۵ء) کی شناخت ریختی گو کی حیثیت سے ہے، البتہ ان کے ہاں مثنویات میں بعض مقامات پر خطوط ملتے ہیں، مثلاً مخمس رنگین میں وہ اپنے بھائی خدا یار خاں کو لکھتے ہیں:

عزیز القدر! میرے یار! بھائی!　　　ستاتی ہے مجھے تیری جدائی
قسم ہے تیرے سر کی، اے خدا یار!　　　بہت بے کل رہے ہے یہ دلِ زار
تجھے معلوم ہو بعد از دُعا کے　　　کہ بھائی! کام ہیں یہ سب خدا کے
جو اپنے دوست یاروں سے جدا کر　　　یہاں پھینکا ہے تنہا مجھ کو لا کر
شفیق اپنا نہ کوئی یار ہے یھاں　　　نہ مونس، نے کوئی غم خوار ہے یھاں
گزرتی ہے عجب صورت سے اوقات　　　تڑپتے ہی کٹے ہی مجھ کو دِن رات
نہ کھانا کچھ خوش آتا ہے، نہ پینا　　　نہ موت آتی ہے،، بھاتا ہے نہ جینا(۱۱)

اس مثنوی میں خدا یار خاں کے علاوہ الٰہی بخش معروف، لالہ بسنت سنگھ نشاط دہلوی، فرخندہ بی طوائف کے نام بھی خط موجود ہیں۔ علاوہ ازیں 'مسدسِ رنگین' میں میر صادق علی، لالہ بسنت سنگھ نشاط، حکیم مسیح الزماں محمد اشرف خاں، خواجہ محمود، مرزا محمد ابراہیم کے نام چھ خط نظم ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی رنگین کے ان خطوں کی زبان و بیان کو اہمیت دیتے ہیں،(۱۲) جب کہ ڈاکٹر صابر علی خاں ان خطوں کی فنی حیثیت سے زیادہ انھیں رنگین کی زندگی کے واقعات، احباب سے ان کے تعلقات اور ذاتی حالات و واقعات کے اعتبار سے اہم سمجھتے ہیں۔(۱۳)

مومن خاں مومن (۱۸۰۰ء-۱۸۵۲ء) کے ہاں دو مثنویاں بطرزِ مکتوب ملتی ہیں، ۳۹/ اشعار پر مشتمل 'نامہ مومنِ جانباز بجانب محبوبہ دلنواز' اور ۳۲/ اشعار پر 'نامہ با سوز و گداز بسمت معشوقہ طنّاز'۔ ابتدائی اشعار میں محبوب کو مخاطب

کیا گیا ہے، اس کے بعد احوال واحساسات بیان کر کے مدعا بیان ہوا ہے۔ پہلی مثنوی کے ابتدائی اشعار اور دوسری مثنوی سے مومن کی طرف سے اپنی دگرگوں حالات اور محبوب کے طرزِ تغافل پر ناراضی کا اظہار پیش کیا جاتا ہے:

تجھ کو واں لافِ کبریائی ہے — یاں بلا دین و دل پہ آئی ہے
تجھ کو دعویٰ ہے بے نیازی کا — حوصلہ کس کو پاک بازی کا
ہے تجھے پاک دامنی کا خیال — مار ڈالے ہے مجھ کو شوقِ وصال
کیوں یہ دعوائے لن ترانی ہے — آخر اِک دن قیامت آنی ہے
شرطِ دیں ہے جو پاک دامانی — تو ستم بھی ہے نامسلمانی
مجھ سے عاشق کی یوں دل آزاری — ہووے فی النار ایسی دیں داری (۱۴)

یہ مثنویاں باقاعدہ خط کی حیثیت رکھتی ہیں اور چند اشعار میں ایک مکمل صورتِ حال پیش کرتی ہیں۔ ان مثنویوں کا زمانہ تحریر معلوم نہیں ہو سکا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (۱۸۰۹ء– ۱۸۶۹ء) عنفوانِ شباب میں دلّی کی ایک طوائف رمجو پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ حسن و جمال کے علاوہ اکتسابِ فنون سے اسے فطری دلچسپی تھی اور فارسی زبان کا اچھا خاصا ذوق رکھتی تھی۔ اس عشق کا دورانیہ ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۸ء تک بتایا جاتا ہے۔ ۱۸۳۷ء میں وہ اچانک دہلی چھوڑ کر چلی گئی تو شیفتہ نے مثنوی کی ہیئت میں اس کے نام تین منظوم خطوط تحریر کیے۔ چونکہ بعد میں شیفتہ کی شخصیت یکسر مختلف ہو گئی، چنانچہ ترتیبِ دیوان کے وقت انھوں نے یہ تینوں مکاتیب نظر انداز کر دیے؛ البتہ یہ قلمی نسخے میں موجود رہے، جو اَب رضا لائبریری رامپور کی ملکیت ہے۔

پہلا منظوم مکتوب چھیاسٹھ اشعار پر مشتمل ہے؛ دوسرا باون اشعار پر؛ جب کہ تیسرا خط پچاس اشعار پر مبنی ہے۔ شیفتہ کے ان خطوں میں اندازِ تخاطب نہایت دل آویز ہے اور اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر اپنے مخاطب پر کس قدر فریفتہ ہے:

اے گُلِ بُوستانِ ناز و ادا — اے مہِ آسمانِ مہر و وفا
اے تمنائے جان وخواہشِ دل — اے فزوں سازِ شوق و کاہشِ دل
اے سمن بُوے نسترن اندام — لالہ رخسار، سرو قد، گُل فام
اے تسلّیِ خاطرِ بے تاب — مایۂ اضطرابِ شیخ و شاب (۱۵)

خطوں میں ہجر و فراق کی تکالیف کا ذکر ہے اور طعن و تشنیع اور توصیف و ترغیب کی کیفیات ملتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

دم بہ دم جی چلا ہی جاتا تھا — وقت رخصت کا یاد آتا تھا
قسمیں، وہ وعدۂ وفا کے ساتھ — وہ یہ کہنا ترا ادا کے ساتھ
کب تلک آؤ گے، یہ کہہ جاؤ — اچھّی تم آج اَور رہ جاؤ
دم رخصت چمٹ کے لگنا گلے — اور وہ کہنا کہ تم تو سچ ہے چلے

یہ جو ہر دم خیال آتے ہیں — اشک کے ساتھ ہوش جاتے ہیں[۱۶]

مکاتیب کا اختتامیہ شیفتہ کی بے تابیوں کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی وصل کی امید قائم کرتا ہے:

لازم تو یہ ہے کہ جلد آؤ — پھر جلوۂ نَو بہ نَو دکھاؤ
ظالم نہ ہو اتنا بے وفا تُو — انصاف سے دیکھ تو ذرا تُو
یہ شیفتہ کیا ہی شیفتہ ہے — آخر یہ ترا ہی شیفتہ ہے
اس پر تو بہت ضرور ہے رحم — ہر چند کہ تجھ سے دُور ہے رحم[۱۷]

غالب (۱۷۹۷ء– ۱۸۶۹ء) کی شاعری سے ایک جانب اُن کے ذوقِ مکتوب نگاری سے شناسائی ہوتی ہے تو دوسری جانب اردو مکتوب نگاری کا بحیثیت ایک صنفِ نثر با قاعدہ آغاز اُن کے ہاتھوں ہوا ہے۔ یہ بات اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ اردو مراسلہ نگاری کو انھوں نے اس کمال تک پہنچا دیا کہ وہ آج تک اپنی خصوصیات کی بنا پر قابلِ ذکر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام میں بھی چند منظوم مکاتیب مل جاتے ہیں، گویا انھوں نے اپنی شاعری اور اپنی نثر کو یکجا کر کے منظوم مکتوب نگاری کی طرف قدم بڑھایا۔ شیفتہ کے نام غالب کا نظمِ معری کی ہیئت میں لکھا ہوا ایک فارسی خط **پنج آہنگ** میں شامل ہے،[۱۸] جب کہاں کا پہلا اردو خط ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا، البتہ ان کے اوّلین منظوم خط کا تعلق ۱۸۵۸ء سے ہے۔ جنگِ آزادی کے بعد دہلی شہر میں انگریز قابض فوج کے ظلم وستم اور شہریوں کی صورتِ حال سے متعلق اپنے تاثرات سے نواب احمد بخش خاں کے پوتے اور نواب امین الدین احمد خاں کے فرزند نواب علاء الدین خاں علائی کو درج ذیل منظوم خط کے ذریعے مطلع کرتے ہیں:

بسکہ فعّالِ مایرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زِنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک — تشنۂ خوں ہے، ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
مَیں نے مانا کہ مِل گئے، پھر کیا؟ — وہی رونا تن ودِل وجاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغ ہاے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہاے گریاں کا
اس طرح کے وِصال سے، یارَب! — کیا مٹے داغ دِل سے ہجراں کا[۱۹]

غالب نے ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۷ء کے دوَران میں کسی وقت اپنے نسبی بھائی نواب علاء الدین علائی کو لکھا تھا:

خوانی بسوے خویش وندانی کہ مردہ ام
دانی کہ مردہ رارہ ورسمِ خرام نیست
نی شیخ سدّوام، نہ الٰہ بخش، مرگِ من

از عالمِ جنابت و مرگِ حرام نیست[۲۰]

جس کے جواب میں نواب صاحب کی طرف سے انھیں لوہارو آنے کی منظوم دعوت دی گئی:

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے | کہ باہم پئیں بادہ اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم بھی کیا خوب ہے | کہ دلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں | کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈاک پر سبز آم | وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکیم باورچیوں کو کہ ہاں | ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جا کے اِملی کے پھول | وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کے لحم طری | کہ کیا کیا اُسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں
کہیں اُن کو بے مہر و کاہل، اگر | لوہارو وہ اس بات پر بھی نہ آئیں[۲۱]

غالب اس پر اپنے ردّ عمل کا اظہار یوں کیا:

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے | پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم | کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سِوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں | نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہُوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں | ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹّے کہاں پائیں اِملی کے پھول | وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار | کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں[۲۲]

ڈاکٹر سید حسن عباس نے ذوق (۱۷۸۹ء–۱۸۵۴ء) کے ایک شاگرد حکیم سلطان رام پوری کے دیوان (۱۸۷۳ء) میں 'کچھ منظوم رقعات' کی اطلاع دی ہے اور یہ کہ اس دیوان کا مخطوطہ علی گڑھ کے نواب رحمت اللہ خاں شروانی کے کتب خانے میں موجود ہے۔[۲۳] افسوس کہ اس کتب خانے تک رسائی نہیں ہو سکی۔

سید علی حیدر نظم طباطبائی (۱۸۵۴ء– ۱۹۳۳ء) کی طرف سے صغرا ہمایوں مرزا (۱۸۸۴ء– ۱۹۵۹ء) کے نام ایک خط منظوم صورت میں ملتا ہے، لیکن اس پر تاریخ و سال درج نہیں ہیں۔ خط کی ابتدا درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے، جب کہ اشعار کے بعد صرف 'علی حیدر طباطبائی' تحریر کیا گیا ہے:

لکھا صغرا ہمایوں میرزا نے | بہت تفصیل سے کشمیر کا حال
زباں اُن کی ہے موجِ آبِ کوثر | قلم اُن کا ہمایوں فر ہما بال
عبارت ہے کہ تصویریں کھنچی ہیں | مطابق کس قدر ہے حال سے قال
یہی کشمیر کا جغرافیہ ہے | یہی کشمیر کے تاریخی احوال[۲۴]

بعد کے چھ اشعار میں کشمیر کی جھیلوں، پہاڑوں، ندیوں، طغیانیوں، وادیوں اور باغوں کے حسن و جمال کا تذکرہ ہے۔

اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء–۱۹۲۱ء) کے ہاں بھی بعض منظوم مکاتیب ملتے ہیں۔ ایک ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۶ء خواجہ حسن نظامی کے نام لکھا ہوا اور دوسرا الہ آباد سے ۲۸/ دسمبر ۱۹۱۹ء کو نامعلوم کے نام؛ لیکن اپنے مندرجات کے پیشِ نظر یہ باقاعدہ خط نہیں، بلکہ قطعات کہے جاسکتے ہیں، جن کا کوئی مخاطب محسوس نہیں ہوتا، محض چند خیالات ہیں؛ شبلی کے نام ان کا دعوت نامہ منظوم خط کہلا سکتا ہے۔ ۷/ مئی ۱۹۰۷ء کو اچانک بندوق چل جانے سے شبلی نعمانی کے گزندِ پا کے واقعہ رونما ہوا۔ اس موقع پر شبلی کے احباب کو بھی بہت صدمہ پہنچا، چنانچہ خطوں کے ذریعے اور بعض نے بذریعہ اشعار ان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اکبر بھی ان کے دوستوں میں سے تھے، چنانچہ انھوں نے شبلی کی دلجوئی کے لیے ان کی ضیافت کا اہتمام کیا اور انھیں یوں اطلاع دی:

آتا نہیں مجھ کو قبلا قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اس کو پلاؤ قلیا (۲۵)

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء–۱۹۱۴ء) کے ہاں فارسی میں 'خطِ منظوم' (۹/ اشعار) اور نامۂ منظوم' (۴/ اشعار) کے عنوان سے دو منظوم خطوں کے علاوہ اردو میں بھی ایک منظوم خط ملتا ہے، جو اکبر کے مندرجہ بالا دعوتی خط کے جواب میں تحریر کیا گیا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال — لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں مَیں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں — حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں مَیں
لیکن اَب مَیں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا — اَب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں مَیں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ، شبلی! ورنہ — جیتے جی مُردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں مَیں (۲۶)

اس خط سے اکبر الہ آبادی کے لیے ان کے دل میں احترام اور دعوت کے باوجود جانہ سکنے کا ملال دونوں کی جھلک بہت نمایاں ہے اور اس حادثے کے شبلی پر اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خط محض کسی خط کا جواب نہیں، بلکہ یہ نظم جملہ شعری خصوصیات سے بھی مملو ہے۔

اقبال کے ہاں نثری مکتوبات کے ساتھ ساتھ آٹھ منظوم مکتوبات بھی ملتے ہیں۔ ان خطوں میں پانچ **بانگِ درا** میں، یعنی (۱) 'طلبہ علی گڑھ کے نام'، (۲) 'عبدالقادر کے نام'، (۳) 'فلسفہ غم'، (۴) 'عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں' اور (۵) 'ایک خط کے جواب میں' شامل ہیں؛ دو **بالِ جبریل** میں، یعنی (۶) 'جاوید کے نام' اور (۷) 'یورپ سے ایک خط' اور ایک **ارمغانِ حجاز** اردو میں، یعنی (۸) 'سر اکبر حیدری، صدرِ اعظم حیدرآباد کے نام' شامل ہیں؛ ان میں سے دو ایسے ہیں، جو باقاعدہ خط کی صورت میں ہی لکھے گئے ہیں۔

بانگِ درا کی نظم 'ایک خط کے جواب میں' سے متعلق مولانا غلام رسول مہر نے دو روایات بیان کی ہیں۔ ایک کے مطابق، کسی دربار سے اقبال کو دعوت آئی تھی، اس کے جواب میں یہ شعر لکھے گئے؛ جب کہ دوسری کے مطابق، کسی دوست نے حکامِ بالا کی نظروں میں اعتبار پیدا کرنے کے لیے مشورہ دیا تھا کہ انھیں کبھی کبھی کھانے یا چائے پر بُلا لینا چاہیے۔(۲۷)
بہر حال، خط کسی دربار سے آیا ہو یا اپنے دوست کی طرف سے، اقبال نے اس کا جواب درج ذیل اشعار کے ذریعے دیا:

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمتِ تگ و تاز — حصولِ جاہ ہے وابستۂ مذاقِ تلاش
ہزار شکر، طبیعت ہے ریزہ کار مری — ہزار شکر، نہیں ہے دِماغِ فتنہ تراش
مِرے سخن سے دِلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز — جہاں میں ہُوں مَیں مثالِ سحاب دریاپاش
یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش
ہُوائے بزمِ سلاطیں دلیلِ مردہ دِلی — کیا ہے حافظِ رنگیں نَوا نے راز یہ فاش
گرت ہواست کہ با خضر ہم نشیں باشی — نہاں ز چشمِ سکندر چو آبِ حیواں باش (۲۸)

[اگر تجھے خضر کے ساتھ بیٹھنے کی آرزو ہے تو آبِ حیات کی طرح سکندر کی آنکھوں سے پوشیدہ رہ۔ ترجمہ از مہر]

سر اکبر حیدری ریاست حیدر آباد دکن کے صدر اعظم تھے۔ اقبال کے نیاز مند تھے اور اقبال کے دورۂ حیدر آباد کے دَوران میں سر اکبر حیدری اور ان کی اہلیہ نے ان کے مہمان داری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، جس کا اظہار اقبال نے متعدد مرتبہ کیا؛ لیکن بقول ڈاکٹر جاوید اقبال، 'گول میز کانفرنسوں کے دَوران میں سیاسی اختلافات کی بنا پر ان تعلقات نے محض رسمی صورت اختیار کر لی تھی'۔(۲۹) انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہُڈ لاہور کی طرف سے یومِ اقبال کی تقریب کا اعلان ہوا تو ۵/ دسمبر ۱۹۳۷ء کے اخبارات میں سر سکندر حیات نے اپنے اخباری بیان میں درج ذیل تجویز پیش کی:

> جس جس شہر میں یومِ اقبال منایا جائے، وہاں کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ شاعرِ اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبال کمیٹی کو چاہیے کہ امپیریل بنک آف انڈیا میں یومِ اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبال کے نیاز مندوں اور ان کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہِ راست بنک کو ارسال کر دیں، جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔(۳۰)

۹/ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور سمیت ہندوستان کے متعدد میں یومِ اقبال منایا گیا تو اگلے ہی روز سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپے کا چیک اقبال کے نام جاری کر دیا۔ چیک کے ساتھ منسلک مراسلے کے مطابق، 'یہ رقم شاہی توشہ خانے سے، جس کا انتظام ان کے ذمے ہے، بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے'۔(۳۱) اقبال ان الفاظ سے سخت برہم ہوئے اور درج ذیل قطعہ کے ساتھ چیک لوٹا دیا:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ 'لے اور شہنشاہی کر — حسنِ تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات'

مَیں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش — کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اُس نے، 'یہ ہے میری خدائی کی زکات'(۳۲)

مولانا عبدالباری آسی (۱۸۹۳ء–۱۹۴۶ء) کا ایک منظوم خط **نقوش** کے مکاتیب نمبر (۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا۔ یہ خط انھوں نے اپنی سالی کے نام لکھا، جس میں انھوں نے اپنی اہلیہ کی ناسازیِ طبع کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آسی کی اہلیہ بیمار تھیں۔ اک رات انھیں کسی قدر قرار آگیا، لیکن اتنے میں مولانا کی نیند اُچٹ گئی، ایسے میں وہ اپنی سالی کو خط لکھنے بیٹھ گئے، لیکن افسوس کہ ایک معروف ادیب کا یہ طویل خط کسی ادبی یا فنی خصوصیت کا حامل نہیں۔

نقوش ۱۰۹ میں حکیم احمد شجاع (۱۸۹۳ء–۱۹۶۹ء) کا ایک منظوم خط ملتا ہے، جس کے مکتوب الیہ کے بارے میں مدیرِ **نقوش** کا قیاس ہے کہ وہ نواب بھوپال ہیں۔ یہ خط نواب صاحب کے کسی خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ خط کے جواب میں لکھی گئی یہ نظم اپنے عہد کے نظریۂ ادب کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

بعد مدت کے ملا شوقِ ملاقات کا خط — کچھ قصور اس میں تمھارا ہی نہیں ہے، اے دوست!

مَیں بھی اس جرم کا مجرم ہوں، مگر کیا کہیے — تیری دنیا میری دنیا ہی نہیں ہے، اے دوست!(۳۳)

انھیں یاد ہے کہ ماضی میں دونوں میں نہایت مخلصانہ تعلقات تھے، لیکن انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے:

کبھی ہم تم میں، یہ سچ ہے کہ شناسائی تھی — پر یہ اُس وقت کا قصہ ہے کہ نادان تھے ہم

یوں بسر ہوتے تھے بچپن میں ہمارے شب و روز — لوگ کہتے ہیں کہ یک قالب و دو جان تھے ہم(۳۴)

نظم کے آخر تک آتے آتے شجاع اسے ایک ایسے موڑ تک لے آتے ہیں، جہاں ایک طرف تو تعلقات کے دوبارہ استواری کی نوید ہے اور دوسری جانب مکتوب الیہ کو دنیاوی شان و شوکت اور عیش و عشرت کی حقیقت سے آگاہ کر دیتے ہیں:

خاک میں مل کے رہے گی نہ کوئی اونچ نہ نیچ — موت کر دے یہ خود ساختہ سطحیں ہموار

وقت آتا ہے کہ مل جائیں گے بچھڑیں ہوئے دوست — تجھ کو مجھ سے نہ جدا رکھے گی کوئی دیوار(۳۵)

حکیم صاحب نے ان اشعار میں نظم اور مکتوب کی جملہ خصوصیات کو یوں یکجا کر دیا ہے کہ اس سے منظوم مکتوب کی تعریف کی تمام شرائط پوری ہو جاتی ہیں۔

اردو کی منظوم مکتوب نگاری میں قمر الہدیٰ فردوسی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام لکھا گیا 'اتحاد و ترقی کے داعی مولانا ابوالکلام آزاد' کے عنوان سے ایک منظوم خط ملتا ہے۔ اس خط کا بنیادی مقصد ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم اقلیت پر عرصۂ حیات تنگ ہونے سے متعلق ہے۔ ابتدائی ۳۹/ اشعار میں فردوسی نے آزاد کو مخاطب کر کے ان کے شخصی، علمی اور سیاسی اوصاف بیان کیے ہیں۔ پہلے دو اور آخری شعر ملاحظہ کیجیے:

اے امام الہند! اے آزادیوں کے تاجدار! — اے امیر کاروانِ حرّیت! گردوں وقار!

اے خطیبِ بے بدل! اے عالمِ اُمُّ الکتاب! — اے زسر تا پا سیاست! اے امامِ انقلاب! (۳۶)

اس کے بعد وہ اُن کی توجہ تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف دِلاتے ہیں:

لیکن اے علم و معارف کے وزیرِ کامیاب — کچھ بہ اندازِ دِگر اَب تجھ سے کرنا ہے خطاب
یعنی اذنِ التجا دارم بہ تو با صد ادب — قابلِ عفوم، صداے غم دہد، سازِ طرب
تجھ سے پوشیدہ نہیں قوم و وطن کی کیفیت — اِن دنوں پوری جوانی پر ہے فرقہ واریت
آج دستِ عقل ہے رخشِ جنوں کی باگ پر — قصرِ مستقبل بنایا جا رہا ہے آگ پر
جا رہی ہے فطرتِ اقوام پستی کی طرف — بڑھ رہا ہے ملک پھر فرقہ پرستی کی طرف
کار فرما ملک میں ہیں قوتیں تخریب کی — توڑ دی کوتاہ بینی نے کمر تہذیب کی (۳۷)

۱۳۱/ اشعار پر مشتمل اس حصے کے اختتام پر وہ آزاد کو اُن کی ذمہ داریاں یاد دِلاتے ہیں، کہتے ہیں:

ضابطہ جینے کا قائم ہے نہ مرنے کا نظام — رو رہی ہے زندگی اور ہنس رہا ہے انتقام
زلزلہ برپا ہے ہر ایوانِ پُر تمکیں میں آج — زہر گھولا جا رہا ساغرِ آئیں میں آج
آج تیری قوم ہے وہم و تذبذب میں اسیر — ایسی حالت میں، بتا، کہتا ہے کیا تیرا ضمیر؟ (۳۸)

اس کے بعد ۹۲/ اشعار میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نامور و مشاہیر کے اسما گنوائے گئے ہیں، جن کے تعاون سے، ملک بھر میں پھیلی ہوئی وحشت و بربریت کے طوفان کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے۔ مکتوب کے آخری دو اشعار میں ابوالکلام آزاد سے درخواست کی جاتی ہے کہ:

الغرض تیار ہے یہ کارواں تیرے لیے — گوش بر آواز ہے ہندوستاں تیرے لیے
قافلہ سالار! در قصرِ حکومت تا بہ کے؟ — نوحِ کشتی! با قلمدانِ وزارت تا بہ کے؟ (۳۹)

آخری شعر نے مکتوب نگار کے دردِ دل کو خون کے آنسوؤں میں تبدیل کر دیا اور یوں یہ مکتوب اپنی تاثیر کی منتہا تک پہنچ گیا۔

نقشِ فریادی میں شامل فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء– ۱۹۸۴ء) کی ایک نظم 'آخری خط' منظوم مکتوب نگاری کی ذیل میں آتی ہے۔ اپنی پیشکش کے اعتبار سے یہ باقاعدہ خط نہیں، بلکہ اس کے عنوان کا تعلق شاعر کے جذبات کی شدت سے ہے۔ اس کے علاوہ **شامِ شہر یاراں** میں 'زنداں سے ایک خط' اور 'ویرا کے نام' کے عنوانات سے ان کے ہاں دو مزید منظوم مکتوب ملتے ہیں، لیکن یہ چونکہ شہرۂ آفاق ترکی شاعر ناظم حکمت کے نظموں کے تراجم ہیں، اس لیے یہ ہمارے دائرہ بحث میں شامل نہیں۔

رضا نقوی واہی (۱۹۱۴ء - ۲۰۰۲ء) کے مجموعہ کلام **نام بنام** (۱۹۷۴ء) میں چونتیس خطوں کے علاوہ پروفیسر عبد المغنی کے نام ایک طویل خط (ص ۷۵ تا ۱۰۸) موجود ہے؛ جب کہ **متاعِ واہی** (۱۹۷۷ء) میں چھبیس، **شعرستانِ واہی** (۱۹۸۳ء) میں آٹھ اور **منظوماتِ واہی** (۱۹۹۲ء) میں سترہ منظوم مکتوبات شامل ہیں؛ لیکن **نام بنام** کے علاوہ ان مجموعوں میں

شامل اکثر مکاتیب محض اشاعتِ مکرر کے زمرے میں آتے ہیں، تاہم اردو ادب کی تاریخ میں منظوم مکاتیب کے سلسلے میں رضا نقوی واہی کا نام سر فہرست دِکھائی دیتا ہے۔

واہی نے مکتوبات کے لیے ہیئت کے تقریباً تمام پیمانوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور تعدادِ اشعار کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ واہی کے ہاں خط کے آغاز ہی سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، جو خط کے آخر تک بر قرار رہتی ہے:

بھائی اختر قادری! واللہ تم بھی خوب ہو — ہے طبیعت میں کبھی خشکی، کبھی مرطوب ہو
ہے کبھی لطف و عنایت اور کبھی پیہم ستم — اپنے رنگِ دلبری میں صاحبِ اسلوب ہو[۴۰]

اسی طرح اُن کے خطوں کے اختتامیے نہایت دلچسپ ہوتے ہیں:

ملتے ہی خط، جواب بہ تفصیل دیجیے — زخموں کا ہو سکا کہ نہیں اندمال جی
کیسی ہے اور کہاں پہ نواسی ہے آپ کی — ہے نانیہال میں کہ گئی دادیہال جی
بچوں کو پیار کیجیے میری دعا کے ساتھ — سردارنی سے کہیے 'سری ست اکال' جی[۴۱]

واہی خطوں میں احوال کو یوں بیان کرتے ہیں کہ بالعموم تکلیف دہ حالات بھی شگفتگی میں بدل جاتے ہیں۔ ایک ایڈیٹر (جاوید شہبازی) کو خط نہ لکھ سکنے پر یوں معذرت کرتے ہیں:

بہر حال، اَب مِرے احوال سنیے اور سر دُھنیے — پھر اس کے بعد عفوِ جرم پر ہو جایئے راضی
بڑے ناگفتنی حالات سے ہے سابقہ میرا — مسلّط ہے کوئی دو ماہ سے صحت کی ناسازی
سبھی بوڑھے جواں بچے رہے اس کے نشانے پر — فلو نے اس طرح کی میرے گھر پر خشت اندازی
مرض نے اس قدر طبعِ رواں کو خشک کر ڈالا — رفو چکر ہوئی اپنے قلم کی ساری طنّازی
اسی افتاد کے باعث جوابِ خط نہ دے پایا — خدا کے واسطے، اس کو نہ سمجھیں آپ لفاظی
اَب اس عالم میں خود ہی سوچیے، کرتا تو کیا کرتا — کہاں سے فکرِ یخ بستہ میں آتی گرم پروازی
پرانی طنزیہ نظمیں، اگر کہیے تو لکھ بھیجوں — اشاعت سے انھی کی ہو، روابط کی خوش آغازی[۴۲]

گویا واہی کے ہاں منظوم مکتوب نگاری کے اکثر خصائص کی موجودگی میں اس موضوع پر باقاعدہ تنقیدی کام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اڑیسہ کے معروف شاعر کرامت علی کرامت (پ:۱۹۳۶ء) کے شعری مجموعے **شاخِ صنوبر** اور **گُل کدۂ صبح و شام** میں حیدر آباد دکن کی معروف افسانہ نگار قمر جمالی کے نام دو منظوم خط ملتے ہیں۔ یہ منظوم خط شعریت سے معریٰ ہیں اور محض سادہ جذبات کو ایک بحر میں پرو دیا گیا۔ رضا نقوی واہی نے **نام بنام** میں کرامت علی کرامت کے نام اپنے ایک خط میں ان کے منظوم خط کے موصول ہونے کی اطلاع دی ہے، لیکن یہ خط کرامت کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں۔

ارشد کمال (پ: ۱۹۵۵ء) کا شعری مجموعے **دھوپ کے پودے** (۲۰۰۸ء) میں ایک نظم 'گھر' کے نام سے شامل ہے، جس کے ذیلی عنوان میں وضاحت کی گئی ہے کہ 'ایک منظوم خط والدہ مرحومہ کے نام'۔ یہ خط کا ہے کو ہے، ایک تیر ہے،

جوہر اُس شخص کے دل میں جا کر پیوست ہو جاتا ہے، جس کی ماں داغِ مفارقت دے گئی ہو۔ شاعر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ جب بھی مَیں غمِ دَوراں سے الجھ کر ہمت ہار جاتا ہوں تو تیرے آنچل سے خود کو ڈھانپ لیتا ہے اور ماضی کے آنگن میں اُتر جاتا ہوں۔ شاعر کو یاد آتا ہے کہ اس کی ماں اس کے کھانے، اس کے سونے جاگنے اور پڑھنے کے معاملے میں کس قدر خیال رکھا کرتی تھی، حتیٰ کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس کی بجھتی ہوئی انگیٹھی کو ہَوا دے سلگاتی تھی۔ اَب، جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تو ارشد کمال پر دیسی بیٹے کی بِپتا کو نہایت بلیغ مصارع میں یوں موزوں کرتے ہیں:

بظاہر تو اکیلی ہی گئی اس دارِ فانی سے

مگر یہ اِک حقیقت ہے

کہ تیری روح کے ہمراہ

گھر کی روح بھی نکلی خموشی سے (۴۳)

مندرجہ بالا منظوم مکتوبات میں سے بعض کا تعلق محض سخن سرائی سے ہے، جب کہ بعض باقاعدہ خط کی حیثیت رکھتے ہیں؛ جن کی موجودگی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ منظوم مکتوب نگاری کی روایت باقاعدہ صورت اختیار نہیں کر سکی، تاہم اس میں کئی امکانات موجود ہیں، جن کا اظہار بالخصوص شیر محمد خاں ایمان، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مرزا غالب، نواب علاء الدین احمد خاں علائی، اکبر الہ آبادی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، حکیم احمد شجاع، رضا نقوی واہی اور قمر الہدیٰ فردوسی کے خطوں سے ہوتا ہے؛ ان میں سے بھی مرزا غالب، علاء الدین احمد خاں علائی، اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی کے رقعات تو لکھے بھی خطوط کی حیثیت سے ہیں۔ اگر اس حوالے سے مزید جستجو کی جائے تو نہایت خوشگوار نتائج بر آمد ہونے کی توقع ہے اور یوں اردو نظم اور اردو مکتوب نگاری میں ایک نیا در وا ہونے کی توقع ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عبد السلام جیلانی: 'شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تصانیف کا علمی تعارف' مطبوعہ جامِ نُور، آئن لائن، امریکا، جون ۲۰۱۸ء بحوالہ http://jaamenoor.online/2018/06/04/شیخ-عبدالحق-محدث-دہلوی-کی-تصانیف-کا-علم-۲/، بتاریخ یکم اپریل ۲۰۱۹ء، صبح ۰۶:۳۳

۲۔ بحوالہ آبِ حیات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۲۵

۳۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد: 'اردو کا ایک قدیم رقعہ' مطبوعہ صحیفہ لاہور، اپریل جون ۱۹۸۴ء، ص ۱-۳

۴۔ محمد ظہیر الدین اظفری: واقعاتِ اظفری مترجمہ عبد الستار، مدراس: اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ۱۹۳۷ء، ص ۱۲۶/ محمد ظہیر الدین اظفری: واقعاتِ اظفری مرتبہ چندرا سیکھرا، مدراس: مدراس گورنمنٹ اورینٹل سکرپٹس، ۱۹۵۷ء ص ۱۹۴

۵۔ افتخار الدین علی خاں شہرت بنام نامعلوم، بحوالہ گارسیں دتاسی: Appendice aux Rudimens de la Langue Hindoustani، پیرس: Imprime Par Autorisation du Rai، ۱۸۳۳ء، ص ۳۹، ۴۱

۶۔ https://archive.urdu.siasat.com/news/مکتوب-نگاری-کی-روایت-۸۳۰۳۶۸-، بتاریخ ۴/ اگست ۲۰۱۹، بوقت ۸:۲۹ شب

۷۔ شیر محمد خاں ایمان: کلیاتِ ایمان مرتبہ سیدہ ہاشمی مجیب، ترمیم و اضافہ از ڈاکٹر محمد علی اثر، حیدر آباد دکن: سیدہ ہاشمی مجیب، ۱۹۸۷ء، ص ۴۱۰

۸۔ ایضاً، ص ۴۰۸

۹۔ ایضاً، ص ۴۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱۱

۱۱۔ بحوالہ ڈاکٹر صابر علی خاں: سعادت یار خاں رنگیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۶ء، ص ۲۰۸-۲۰۹

۱۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخِ ادبِ اردو سوم، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۶ء، ص ۳۱۸

۱۳۔ ڈاکٹر صابر علی خاں: سعادت یار خاں رنگیں، ص ۲۲۳-۲۲۴

۱۴۔ کلیاتِ مومن مرتبہ کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، دوم ۲۰۰۸ء، ص ۴۹۴

۱۵۔ شیفتہ: کلیاتِ شیفتہ مرتبہ کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۹

۱۶۔ ایضاً، ۱۸۶

۱۷۔ ایضاً، ۱۸۴

۱۸۔ غالب: پنج آہنگ، آہنگِ پنجم مترجمہ محمد عمر مہاجر، ادارہ یادگارِ غالب کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۴

۱۹۔ غالب: دیوانِ غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۳۵۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵۶ (حاشیہ)

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۵۶-۳۵۷ (حاشیہ)

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۵۶-۳۵۷

۲۳۔ ڈاکٹر سید حسن عباس: 'مثنوی نامہ شوق از حکیم سلطان رام پوری شاگردِ ذوق'، مطبوعہ ہفت روزہ ہماری زبان دہلی، یکم تا ۷ فروری ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱

۲۴۔ نظم طباطبائی بنام صغر اہمایوں میرزا مطبوعہ نقوش لاہور (مکاتیب نمبر)، شمارہ ۶۵-۶۶، ص ۲۶۰

۲۵۔ اکبر الہ آبادی: کلیاتِ اکبر اوّل، ظفر پریس لکھیم پور، ہشتم ۱۹۳۶ء

۲۶۔ شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی اردو مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۵

۲۷۔ غلام رسول مہر: مطالبِ کلامِ اقبال اردو، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن

۲۸۔ اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، گیارہویں اشاعت ۲۰۱۳ء، ص ۲۶۸/۲۵۲

۲۹۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رُود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، دوم ۲۰۰۸ء، ص ۳۷۲

۳۰۔ بحوالہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی: اقبال کے آخری دو سال، ص ۵۴۱، ۵۴۲

۳۱۔ بحوالہ ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رُود، ص ۶۸۷

۳۲۔ اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، ص ۶۱/۵۳۷

۳۳۔ حکیم احمد شجاع: 'ایک والیٔ ریاست کے مکتوبِ گرامی کے جواب میں' مطبوعہ نقوش ۱۰۹ (خطوط نمبر)، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ص ۵۵۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۵۵۵

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ قمر الہدیٰ فردوسی: اتحاد و ترقی کے داعی مولانا ابوالکلام آزاد، شکوہ آباد (اترپردیش): دارالہدایت، ۱۸۴۸ء، ص: ۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۴-۵

۳۸۔ ایضاً، ص ۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶

۴۰۔ رضا نقوی واہی: نام بنام مرتبہ پریم گوپال متل، دہلی: پی کے پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء، ص ۱۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۵۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۶۱-۶۲

۴۳۔ ارشد کمال: دھوپ کے پودے، دہلی ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص ۳۵